حقیقتِ احسان

(عبادت کرنے کا صحیح طریقہ)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	اسلام، ایمان اور احسان کے معنی	۷
۲	آداب سوال	۹
۳	صحابہ رضی اللہ عنہم کو کثرتِ سوال کی ممانعت کی وجوہ	۹
۴	احسان کے معنی	۱۱
۵	طلب دنیا میں انہماک	۱۲
۶	ترقی کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب	۱۲
۷	صحابہ رضی اللہ عنہم کی خشیت وعبادت	۱۴
۸	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تقویٰ وخشیت	۱۵

۹	احکام دین کے بارے میں لوگوں کے عذر	۱۶
۱۰	مدعیانِ ترقی کا منہ توڑ جواب	۱۷
۱۱	طالبینِ دنیا کی عبادت کا حال	۱۸
۱۲	عبادت کی روح	۱۸
۱۳	تفہیم عبادت میں لوگوں کی کوتاہی	۱۹
۱۴	وسعتِ فقہ	۲۰
۱۵	عمل کے اہتمام کی ضرورت	۲۰
۱۶	علم بے عمل بیکار ہے	۲۱
۱۷	عبادت میں کوتاہی	۲۱
۱۸	خشوع کی ضرورت واہمیت	۲۲
۱۹	کتب تصوف کی اہمیت وضرورت	۲۴
۲۰	علمِ باطنی کے حصول کی ضرورت	۲۵
۲۱	جاہلانہ حکایات	۲۵
۲۲	بخیل کا حال	۲۶

۲۳	غلط علاج	۲۷
۲۴	خشوع کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی مثال	۲۸
۲۵	استغراق ومحویت کا انکار درست نہیں	۲۸
۲۶	خشوع کی حقیقت ومعنی	۲۹
۲۷	وسوسہ کا آنا بُرا نہیں لانا بُرا ہے	۳۱
۲۸	شیطان ایمان والے کے پاس ہی آئیگا	۳۱
۲۹	وساوس کا علاج	۳۲
۳۰	خیالات سے پیچھا چُھڑانے کا طریقہ	۳۳
۳۱	طالب کا حال	۳۵
۳۲	نماز میں دل لگانے کے طریقے	۳۷
۳۳	دوسرا طریقہ	۳۷
۳۴	ہر لفظ سوچ سوچ کر پڑھنے سے نماز میں دل لگے گا	۳۸
۳۵	حضور ﷺ کی تعلیم کی خوبی	۳۹
۳۶	حضورِ قلب کا طریقہ	۳۹
۳۷	مضمونِ حدیث کی تفہیم میں ایک غلطی کا ازالہ	۴۰

۳۸	حدیث کے معنی کی وضاحت	۴۰
۳۹	خشوع کی اقسام	۴۱
۴۰	خشوع میں غلو	۴۲
۴۱	خودرائی کی بُرائی	۴۳
۴۲	خشوع کس کے لئے کس درجہ میں ہے	۴۴
۴۳	کسب معاش سے بےفکروں کو حبِ الٰہی میں غرق ہونا چاہیئے	۴۴
۴۴	مقربین کے لئے مشقت	۴۶
۴۵	مشغول آدمی کے لئے خشوع کا مطلوب درجہ	۴۷
۴۶	خلاصہ وعظ	۴۷

وعظ

حقیقتِ احسان

(عبادت کرنے کا صحیح طریقہ)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ ۱۷/ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ دو گھنٹہ بیس منٹ تک جامع مسجد کانپور میں فرمایا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارك وسلم اما بعد:

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم:((الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ فان لّم تکن تراہ فانہ یراك))

اسلام، ایمان اور احسان کے معنی

یہ ایک حدیث شریف کا ٹکڑا ہے اور جواب ہے ایک سوال کا جو حضرت جبرئیل علیہ السلام خدمتِ نبوی ﷺ حاضر ہوکر کیا تھا۔ جس کا پورا قصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کہ اس حالت میں کہ ہم ایک دن رسول اللہ ﷺ کے نزدیک موجود تھے۔ ناگاہ ہم پر ایک ایسا شخص ظاہر ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت کالے تھے، اس پر سفر کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ بھڑ کر باادب بیٹھ گیا۔(۱) اور

(۱) قریب ہوکر باادب بیٹھ گیا۔

پوچھنے لگا کہ یا رسول اللہ ﷺ کس کو کہتے ہیں؟ حضور ﷺ اعمالِ اسلامیہ کو ذکر فرمایا کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ جاننا، اور محمد ﷺ رسول اللہ ہونے کی تصدیق کرنا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان شریف کے روزے رکھنا، اور استطاعت ہونے پر بیت اللہ کا حج ادا کرنا۔

یہ سن کر اس شخص نے آپ ﷺ کی تصدیق کی کہ آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ ایمان کس کو کہتے ہیں؟ حضور ﷺ عقائد اسلامیہ کو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرنا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا اور قیامت کے دن پر ایمان لانا اور تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لانا۔ اس شخص نے اس کو بھی سن کر کہا کہ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔

پھر اس نے حضور ﷺ سوال کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر نہیں دیکھتے ہو تم اس کو پس وہ تحقیق تم کو دیکھتا ہے''

اس سوال کے علاوہ اس شخص نے اور سوال بھی کئے تھے جو پوری حدیث میں مذکور ہیں۔ اور حضور ﷺ ان سب کے جواب بخوبی ارشاد فرمائے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں کہ اس شخص کے چلے جانے کے بعد حضور ﷺ مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے عمر رضی اللہ عنہ جانتے بھی ہو کہ یہ سوال کرنے والے کون تھے؟ میں نے حضور ﷺ عرض کیا کہ ((اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ))(۱) ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ جاننے والے ہیں''۔

(۱) ادب کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ اس طرح کہہ دیا کرتے تھے ۱۲ جامع۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا: ((فَاِنَّهٗ جِبْرَئِيْلَ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ)) ''یعنی یہ سوال کرنے والے جبرئیل علیہ السلام، تمہارے پاس اس لئے آئے تھے کہ تم کو تمہارا دین سکھلا دیں''

آدابِ سوال

وجہ اس آنے کی یہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پوچھ گچھ سے منع فرمایا تھا۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امور دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو پیش آئیں یا واقع ہوں ان کا پوچھنا تو ضروری ہے اس سے ممانعت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ محض فرضی صورتیں نکال نکال کر احتیاطاً پوچھ رکھنا اگرچہ ابھی نہ ہوئی ہوں، جیسے اب بھی ایک تو عام لوگ ہیں ان کو تو یہ چاہیئے کہ جب کوئی امر پیش آوے اس وقت دریافت کرلیں یا ایسا کوئی امر جس کا واقع ہونا غالب ہو وہ دریافت کرلیں۔ یہ نہیں کہ فرضی بعید الوقوع (۱) صورتیں دریافت کرکر کے پریشان کریں۔ البتہ طلباء جن کا کام ہے مسائل کی تحقیق کرنا وہ اگر دریافت کریں تو مضائقہ نہیں اور بعض لوگوں کی جو یہ عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ مولویوں کو دِق کرنے کے لئے (۲) ایسی باتیں پوچھا کرتے ہیں جن کی کوئی صورت نہیں، یہ سب بیکار وفضول ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوال کی ممانعت کی وجوہ

صحابہ رضی اللہ عنہم کو سوال سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا تھا اس کی کئی وجہیں ہیں۔

اول تو یہ کہ ایسی فرضی باتیں دریافت کرنا خلافِ ادب تھا۔ دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بات خود ہی بیان فرمادیا کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) ''مجھ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے'' یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبی ہی تھا،

(۱) ایسی صورتیں گھڑ کر پوچھیں جن کا واقع ہونا ہی بعید ہے (۲) پریشان یا تکلیف دینے کے لئے۔

اور خود آپ اعلیٰ درجہ کی شفقت رکھتے تھے۔ ضرورتوں کو سمجھتے تھے آپ بغیر پوچھے بتلادیا کرتے تھے، ایسی حالت میں سوالات کرتے رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی جس طرح اگر کوئی طبیب حاذق شفیق ہو اس نے نبض دیکھ لی۔ ضروری امور دریافت کر کے تشخیص کر لی نسخہ لکھ دیا، پرہیز بتلادیا۔ سارے ضروری امور سے خود ہی غایت شفقت کے باعث سے آگاہ کر دیا(۱) تو پھر ایسے شخص سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔

تیسری یہ بھی مصلحت ہوسکتی ہے کہ بعض منافقین گھڑ گھڑ کر صورتیں پوچھا کرتے تھے اور غرض اس سے محض دِق کرنا ہوتا تھا اس لئے مسلمانوں کو بھی منع کر دیا گیا تاکہ منافقین کو آڑ نہ ملے۔ چنانچہ خود مجھ سے ایک شخص نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ دو شخص چلے جاتے تھے اور ان کے ہمراہ ایک عورت تھی، ایک شخص اس کا خاوند تھا دوسرا اس کا بھائی۔ اتفاق سے چوروں نے دونوں کو قتل کر ڈالا سر تن سے جدا ہوگیا، وہ رونے لگی۔ اتفاق سے ایک درویش کامل کا اُدھر سے گذر ہوا۔ انہوں نے واقعہ دریافت کرنے کے بعد اس عورت سے کہا کہ دونوں کے سر دھڑ سے لگادے۔ اس نے خاوند کے دھڑ کے ساتھ بھائی کا سر اور خاوند کا سر بھائی کے دھڑ کے ساتھ لگادیا۔ انہوں نے دعا کی دونوں زندہ ہوگئے۔ تو بتلاؤ کہ وہ عورت کس کو ملے گی؟ میں نے کہہ دیا کہ جناب مجھے نہیں معلوم۔ ایسی باتوں کے پوچھنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ جواب نہ دے سکیں گے تو ہم کہیں گے کہ ہم نے ایسی بات پوچھی کہ اس کا جواب عالم سے بھی نہیں آیا یا ہم ایسے بڑے ہیں ایسے ذہین ہیں اور بس۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ بعض باتیں آسان ہوتی ہیں اور پوچھنے کی بدولت دشوار ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ جب حج فرض ہوا تو ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ((اَفِیْ کُلِّ عَامٍ

(۱) انتہائی شفقت کی وجہ سے ساری ضروری باتوں سے خود ہی آگاہ کر دیا۔

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ))'' کیا ہر سال میں ہی یا رسول اللہ ﷺ پھر کچھ دیر سکوت فرمایا۔ پھر ارشاد کیا کہ اگر میں نَعم (ہاں) کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم لوگوں سے نہ ہوسکتا مصیبت میں پڑ جاتے۔ اور آپ ﷺ ارشاد فرمایا: کہ ((ذَرُوْنِیْ مَا تَرَکْتُکُمْ)) یعنی مجھ کو چھوڑے رکھو جو مناسب سمجھوں گا اس سے تم کو آگاہ کر دیا کروں گا تم کھود کھود کر نہ پوچھا کرو، یہ وہ مصلحتیں تھیں جو ممانعتِ سوال کا باعث تھیں اور اس وقت میرے خیال میں آئیں ممکن ہے کہ اَور اَور بھی مصلحتیں ہوں۔

بہر حال ممانعت سوال کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم سوال کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ بعض امور (۱) اُن کے خیال میں آتے ہوں گے لیکن اس میں تردّد ہو جاتا ہوگا کہ نہ معلوم یہ باتیں ضروری ہیں یا نہیں، ان کا پوچھنا بے ادبی تو نہیں ہے اس لئے ڈر کے مارے نہ پوچھ سکتے تھے۔ یہ بھی ایک مرتبہ ہے جو حاصل کرنے کے قابل ہے کہ جو دل میں کھٹکے اُسے ترک کر دیا جاوے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: ((دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلیٰ مَا لَا یُرِیْبُكَ)) ''یعنی جس چیز سے تمہیں کھٹکا ہو اسے چھوڑ کر ایسی چیز اختیار کرو جس میں کھٹکا نہ ہو'' پس خدائے تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام لئے بھیجا تھا کہ وہ پوچھیں گے تو صحابہ رضی اللہ عنہم سی دین کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

احسان کے معنی

اب یہ سمجھئے کہ میں نے اس وقت اس لئے احسان کے بیان کو اختیار کیا ہے کہ اس کی بڑی ضرورت ہے، لوگ اس سے بالکل غافل ہو رہے ہیں۔ احسان

(۱) بعض باتیں۔

کے متعارف معنی جو اردو میں مشہور ہیں وہ یہاں مراد نہیں، یہ عربی لفظ ہے اس کے معنی ہیں اچھا کرنا، اور یہاں مراد ہے عبادت کو اچھا کرنا۔

طلبِ دنیا میں انہماک

اب دیکھئے اول تو لوگ عبادت ہی سے بھاگتے ہیں اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ دنیوی کاموں میں دن رات لگے رہتے ہیں، ذرا ذرا سی باتوں کے لئے مشقت اُٹھاتے ہیں۔ خصوصاً اگر تھوڑی سی دنیاوی امید ہوتی ہے تو بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور مشقتیں اٹھانے میں دریغ نہیں کرتے لیکن عبادت میں کوتاہی کرتے ہیں اور دنیا طلبی میں سرگرم ہیں۔ اس پر طرہ (۱) یہ ہے کہ اس کی (یعنی دنیا طلبی کی) اور ترغیب دی جاتی ہے، جلسے ہوتے ہیں، کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں اور کوشش ہے کہ خوب مال ودولت کی حرص بڑھ جاوے ہویٰ وہوس میں ترقی ہو، دن رات ترقی ترقی کی پکار ہورہی ہے، ہویٰ وہوس کا نام بدل کر ترقی رکھ دیا ہے۔ آخر اس سے مطلب کیا ہے، یہی نا کہ مال خوب حاصل کیا جاوے، مکان بھی نہایت عالیشان ہو، کپڑے بھی نہایت قیمتی ہوں، اسباب بھی بیش بہا ہو، غرضیکہ دنیاوی عیش وسامان کے جمع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاوے۔ چاہے دین رہے یا جائے۔

ترقی کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب

لیکن یہ بھی معلوم رہے کہ ترقی کا مسئلہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں جس کا نہایت معتبر اور سچا واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔

(۱) اس پر مزید تماشا یہ ہے۔

آپ ﷺ تشریف فرما نہ پر تشریف رکھتے تھے۔ وہاں صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی آپ ﷺ اس پر لیٹے ہوئے تھے جسم شریف پر چٹائی کے نشان بن گئے تھے اور سرہانے کی جانب کچھ کچے چمڑے لٹک رہے تھے پائنتی کی جانب کچھ ببول (۱) کی پتیاں پڑی ہوتی تھیں تا کہ ان چمڑوں کو ان سے دباغت دے دی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حالت کو دیکھ کر رونے لگے، آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اور عرض کرنے لگے کہ یا حضرت ﷺ اور کسریٰ وغیرہ جو شرک اور کفر میں مبتلا ہیں خدا کی عبادت نہیں کرتے وہ تو چین و آرام سے زندگی گذاریں اور آپ اس تنگی کی حالت میں بسر کریں۔ آپ دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ آپ کی امت کو وسعت عنایت کرے۔

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سبب تھا کہ امت کی وسعت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَفِیْ شَکٍّ اَنتَ یَا ابْنَ الْخَطَّاب)) ''کیا اے عمر رضی اللہ عنہ الخطاب تم اب تک شک ہی میں پڑے ہوئے ہو'' ((اُولٰٓئِکَ عُجِّلَتْ لَھُمْ طَیِّبَاتُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا)) ''ان کو لذیز چیزیں دنیا میں جلدی سے مل گئی ہیں'' مطلب یہ ہے کہ تمام آرام و آرائش کفار کو دنیا ہی میں مل گیا ہے آخرت میں وہ محروم رہیں گے۔ اور ہم لوگوں کے لئے خدائے تعالیٰ نے آخرت میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے افلاس اور تنگدستی کی شکایت کی تھی اور چاہا تھا کہ دعا کردی جائے اور فراغت اور وسعت ہوجائے۔ مال و دولت بافراط مل جائے، خوب ہی آسائش و آرام سے گذرنے لگے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ترقی کی درخواست کی تھی اور چاہا تھا کہ

(۱) کیکر کی پتیاں۔

جیسے کفار کو مال ودولت میں ترقی حاصل ہے اسی طرح مسلمان بھی ترقی کریں۔ آپ ﷺ نے فیصلہ فرمادیا کہ انکو یہاں مل گیا ہے ہم کو قیامت میں ملے گا۔ایک یہ بات لوگ بہت کہا کرتے ہیں کہ اُس زمانہ میں ترقی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ دوسری قومیں بھی ترقی یافتہ نہ تھیں، اب ضرورت ہے۔ان سے دریافت کرنا چاہیئے کہ کیا اس زمانہ میں کسی نے ترقی نہ کی تھی قیصر اور کسریٰ کی عیش پرستیاں اور عیش ونشاط کے سامان دیکھئے، تاریخ پڑھئے۔ مال ودولت میں عیش وآرام میں تزک واحتشام میں کیا تھا جو اُن کے پاس نہ تھا عمدہ سے عمدہ سامان عشرت مہیا تھے۔اور مسلمانوں کے پاس وہ سامان اور اسباب نہ تھا۔ پھر بھی حضور ﷺ نے یہی ارشاد فرمایا جو اوپر مذکور ہوا۔تو اب کیا باقی رہ گیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی خشیت وعبادت

بلکہ اگر غور کیا جائے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو افراطِ دنیا سے کچھ ضرر بھی نہ ہوسکتا تھا، کیونکہ قلب نہایت قوی رکھتے تھے۔ خدا کی اطاعت فرمانبرداری ان کے دلوں میں رگ وریشوں میں گھسی ہوئی تھی۔ دل وجان سے احکامِ شرعیہ کی تعمیل پر آمادہ اور سرگرم رہتے تھے۔خدا کے خوف سے ہر وقت لرزاں وترساں رہا کرتے تھے۔

اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اگر کسی شخص کو سانپ کے پکڑنے اور اس کے زہر کے اثر نہ کرنے کا منتر یاد کرادیا گیا ہو تو وہ سانپ کو بے کھٹکے پکڑ سکتا ہے۔ اگرچہ سانپ اس کے ہاتھ میں ہو۔مگر وہ ہر طرح سے مطمئن رہتا ہے۔ دنیا اگرچہ سانپ کے مثل تھی لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا منتر یاد تھا۔یعنی ذکر اللہ، خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ایسی حالت میں اُن کو دنیا سے کیا ضرر ہوسکتا تھا۔ بخلاف ہم لوگوں کے کہ منتر تو یاد نہیں اور سانپ کو پکڑنا چاہتے ہیں۔آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

ہلاکت جہاں ذرا اس نے ڈسا اور خاتمہ ہوا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ حالت تھی کہ اس کا کچھ کہنا ہی نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تقوی وخشیت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کی دیانت، حق پرستی، قوتِ ایمان ایسے تمام اخلاق و صفات موافقین کیا مخالفین کے نزدیک بھی مسلم الثبوت ہیں ذرا ان کی حالت دیکھئے خلافت کا تو زمانہ اور کپڑے پیوند لگے پہنے ہوئے چکنا سالن تک نہ کھاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی دعوت کی تھی، اور گوشت پکا رکھا تھا، جس میں گھی بھی کسی قدر ڈالا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا میاں تم نے تو ایک سالن کے ساتھ دوسرا سالن بھی جمع کر دیا ہے۔ یعنی ایک تو گھی اس سے بھی روٹی کھائی جاسکتی ہے دوسرا گوشت کہ اس سے بھی روٹی کھاسکتے ہیں اس قدر اسراف اور تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں نے اس میں مقدار معین سے زیادہ صرف نہیں کیا ہے۔ جس قدر خرچ لے کر گوشت خریدنے نکلا تھا اسی قدر میں بوجہ معمولی گوشت ہونے کے تھوڑے کا گوشت لے لیا اور باقی کا گھی خرید لیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بات صحیح ہے مگر میرے نزدیک غیر مناسب ہے۔ القصہ وہ کھانا آپ نے نہیں کھایا۔ چھپّر رہنے کو تھا، کوئی بڑا محل نہ تھا، دربان نہ تھے، پہرہ چوکی نہ تھا، اپنے کام کو خود کرلیا کرتے تھے راتوں کو گشت لگاتے تھے، لوگوں کی حالت دریافت کرتے تھے، ضعفاء اور مساکین کی خبر لیتے تھے، پھر بھی آپ کی کیفیت اور حالت کو دیکھئے بغور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جن کا صاحبِ اسرار لقب ہے اس وجہ

سے کہ حضرت ﷺ نے ان کو منافقین کے نام بتلادیئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے قسم دے دے کر پوچھا کرتے تھے کہ سچ بتلانا کہیں میرا نام تو ان لوگوں میں نہیں ہے۔ جب تقویٰ اور خشیت کی یہ حالت ہو تو پھر اگر ایسے لوگوں کے پاس دنیا ہوتی تو ان کو کیا ضرر ہوسکتا تھا۔

احکامِ دین کے بارے میں لوگوں کے عذر

اب بتلایئے کہ اُس زمانہ کے مناسب کیوں ترقی نہ تھی اور اِس زمانہ کے مناسب کیوں ہے؟ کیا اُس زمانہ میں کچھ ترقی نہیں ہوئی تھی؟ اکاسرہ اور قیاصرہ(۱) کے پاس کس چیز کی کمی تھی، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ضرر کا احتمال بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے اور تمام چیزوں میں بھی یہی عذر کیا کرتے ہیں۔ نماز کی نسبت کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ضرورت تھی جب نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، کیونکہ بُت پرستی حال ہی میں چھوڑی تھی اس لئے ضرورت تھی کہ خدا کی عبادت کریں تاکہ بتوں کا خیال دل سے نکل جائے۔ روزہ رمضان کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں غصہ وغیرہ کا غلبہ تھا قوت کا زور تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ روزہ رکھیں تاکہ ضعف آجائے وہ سختی جاتی رہے۔ اب خود ہی لوگ ضعیف اور مہذّب ہو رہے ہیں اب کیا ضرورت ہے۔ رہا حج چونکہ وہ تجارت کا ذریعہ تھا، تجارت کے لئے لوگ جمع ہوا کرتے تھے حج کی بھی پخ(۲) لگادی۔ رہ گئی زکوٰۃ سو وہ تو ان کی ترقی کے بالکل خلاف ہے۔ تصویروں کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے لوگ بت پرستی کے عادی ہو رہے تھے، اس کو اچھا سمجھتے تھے، اسلام لانے کے بعد پہلا خیال کچھ نہ کچھ دل میں بسا ہوا تھا، اگر تصویر وغیرہ رکھتے تو خیالِ سابق میں زیادتی ہوتی اور بت پرستی کا ذریعہ ہوجاتا اب کیا ضرورت

(۱) قیصر وکسریٰ کی قوموں کے پاس (۲) پابندی۔

ہے۔ اب تو بعض بت پرست قومیں بھی اس کی قباحت کو تسلیم کرتی جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں میں تو پشتہا پشت سے بُت پرستی کا نام بھی نہیں، اب تصویر سے کیا حرج ہے۔

غرض طوفانِ بے تمیزی برپا کر رکھا ہے جو کچھ جی میں آتا ہے لکھتے ہیں۔ یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اسلام ہی کی ضرورت نہیں، چلو چھٹی ہوئی۔ دعویٰ تو اسلام کا اور اس کے تمام احکام سے انکار۔ ہر ہر چیز کے ساتھ پھیر پھار کر دین سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔ صاف صاف انکار کرنا تو ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بُرا کہیں گے۔

مدعیانِ ترقی کا منہ توڑ جواب

اگرچہ بعض نے ہمت کر کے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے(۱) ایک کمیٹی لکھنؤ میں ہوئی تھی ترقی کے ذرائع اور موانع سوچنے کے متعلق (۲) وہاں ایک صاحب نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے۔ ایک صاحب نے وہیں خوب ہی جواب دیا اور کہا واقعی یہی بات ہے، لیکن مذہب کی طرح قانون بھی مانع ترقی ہے، جب مذہب سے دستبردار ہو تو قانون کو بھی چھوڑ دو۔ چوری ڈکیتی کی جائے تو بہت سا مال جمع ہوسکتا ہے۔ اگر موقع ہو اور کسی کے قتل سے مال ہاتھ آتا ہو تو اس سے دریغ کرنے کی کیا وجہ؟(۳) غصب کو بھی جی چاہتا ہوگا پھر کون مانع ہے یہی نا کہ قانوناً ان امور کے مرتکب ہونے والے کو سزا ہوتی ہے۔ ذرا خلافِ قانون کریں تو خبر لی جائے۔ انصاف تو یہ تھا کہ اگر مذہب سے دستبردار ہوتے تھے تو قانون کو بھی چھوڑ دیتے اس کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ غضب ہے حکام ظاہری کے قانون کا تو اتنا خوف اور حاکم حقیقی اور تمام جہاں کے بادشاہ یعنی اللہ

(۱) مذہب ہی ترقی میں رکاوٹ ہے (۲) ترقی کے ذریعے اور اس میں موجود رکاوٹوں کے بارے میں غور کرنے کے لئے (۳) اس کو چھوڑنے کی کیا وجہ۔

تعالیٰ کے قانون میں یہ دلیری اور گستاخی، عجب اندھیر ہو رہا ہے۔

طالبینِ دنیا کی عبادت کا حال

دنیا میں انہماک ہے ایسی حالت میں عبادت کی بھلا کہاں نوبت آسکتی ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو توفیق ہوئی بھی تو محض صورت عبادت کی ہوتی ہے معنی عبادت کے بالکل نہیں ہوتے۔ معنی سے یہ عبادت محض معرّٰی (۱) ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بادام تو ہو اور اس میں مغز نہ ہو، صرف پوست ہی پوست ہو (۲) یا جیسے دیوالی کی مورتیں اور تصویریں ہوتی ہیں کہ یہ کمہار ہے یہ لوہار وغیرہ ہے سب ہی کچھ ہے لیکن اصلیت نہیں۔ نام کو آدمی لیکن آدمیت نہیں۔ نام تو ہاتھی ہے اور کام کچھ نہیں کرسکتا۔ کسی چیز کو لادنا تو درکنار وہ خود خریدنے اور بنانے والے پر لدا لدا پھرتا ہے۔ اگر کوئی حاکم کسی سے کہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اور کوئی شخص آدمی کی تصویر پیش کردے کہ حضور اس کو نوکری میں قبول فرمادیں، تو کیا وہ حاکم اس بیوقوف نادان سے ناراض نہ ہوگا، اور اس کی بیہودہ حرکت کو سخت بے ادبی اور گستاخی نہ سمجھے گا، سزا نہ دیگا؟ تو پھر بڑے غضب کی بات ہے کہ ہم خدا کے سامنے اس طرح کے آدمی یعنی صورتِ آدمی کے مثل صورت عبادت کو بے خوف وخطر پیش کریں اور گستاخی کا ذرا خیال بھی نہ آئے۔ عبادت بے جان تو پیش کریں اور شرماویں نہیں۔

عبادت کی روح

اب سمجھنا چاہیئے کہ عبادت کی روح اور جان کیا ہے، اس کی حقیقت اور صورت میں کیا فرق ہے۔ کونسی چیز ہے جس کے ہونے سے صورتِ عبادت اصلی عبادت ہوجاتی ہے، اس کا کیا درجہ ہے پس اس حدیث سے دیکھئے عبادت کے اچھا

(۱) خالی ہوتی ہے (۲) گری نہ ہو صرف چھلکا ہی چھلکا ہو۔

کرنے کی حقیقت بتلائی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے اچھا ہونے کے کیا معنی ہوا کرتے ہیں۔ یعنی اس میں کوئی نقصان نہ ہو کوئی کسر نہ رہے جیسی چاہیئے ویسی ہی ہو۔ غرض ہر چیز کا اچھا ہونا اس کے مناسب جدا طریق سے ہوتا ہے۔ مثلاً اچھی روٹی وہ ہوگی جس کا مادہ بھی اچھا صورت بھی اچھی ہو جو اس کا ثمرہ ہے وہ بھی اچھا ہو۔ اسی طرح یوں کہا کرتے ہیں کہ فلاں طالب علم امتحان میں اچھا رہا، یعنی اس کی تقریر بھی اچھی تھی، تحریر بھی، طرزِ بیان بھی خوب صاف تھا، مطلب واضح تھا، حشو و زوائد سے کلام مبرّا تھا(۱)، یعنی تمام ضروریات مجتمع تھیں۔ کوئی حالت ایسی نہ تھی جس کی کمی رہ گئی ہو۔ اسی پر قیاس کر کے عبادت کے اچھا ہونے کے معنی بھی سمجھئے۔ کہ جتنے امور کی عبادت میں ضرورت ہے جو جو چیزیں واجب الاجتماع ہیں سب کی سب اس میں پائی جاویں، کسی چیز کی کسر نہ رہے۔

تفہیم عبادت میں لوگوں کی کوتاہی

یہ تو اجمالاً تھا، اب اس کی تفصیل کہ وہ کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن سے عبادت اچھی ہوتی ہے شرائع میں غور کرنے سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ لوگ عموماً غلطی کرتے ہیں اور صرف صورت اور نقلِ عبادت ہی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ یعنی فقہاء نے جو ضبط کر دیا ہے قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ، قومہ وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اور جو فقہ کا موضوع تھا اُس کے موافق انہوں نے لکھا ہے۔ لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ تمام امور جن کا عبادت سے تعلق ہے اس میں منحصر ہیں (۲)۔ شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ اور کچھ بھی ہے۔

(۱) اس کے کلام میں بیکار باتیں نہیں تھیں (۲) بس یہی ہیں۔

وسعتِ فقہ

اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ یعنی معنی شرع کا بھی اعتبار ہے اس معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں۔ تصوف کو علیٰحدہ اور الگ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جائے۔ یہ علیٰحدگی ایسی ہے جیسی فقہ مشہور میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ الگ الگ کتابیں ہیں۔ کتاب الصلوٰۃ کے مسائل کتاب الزکوٰۃ میں نہیں ملیں گے اور نہ کتاب الزکوٰۃ کے کتاب الصلوٰۃ میں۔ اس سے کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ کتاب الزکوٰۃ یا کتاب الصلوٰۃ فقہ میں داخل نہیں۔ اسی طرح کتاب التصوف بھی فقہ ہے۔ اگرچہ اس کی کتابیں الگ ہیں۔ اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جائیں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسی طرح توحید، اخلاص یا کبر، تواضع، عجب وغیرہ اخلاقِ حمیدہ اور رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں۔

عمل کے اہتمام کی ضرورت

عموماً لوگ نماز میں قیام، رکوع وغیرہ ہی کو عبادت کی حقیقت سمجھتے ہیں، اور اسی میں عبادت کو محصور جانتے ہیں۔ عوام تو عوام طالب علموں کی بھی شکایت ہے۔ ہم لوگوں کی خود حالت قابلِ افسوس ہے۔ اہلِ علم خود اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو علم کی تو فکر ہے لیکن عمل کی نہیں۔ بڑا اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ ہم ساری کتابیں پوری کرلیں۔ ہدایہ بھی، صدرا بھی، شمس بازغہ بھی، لیکن عمل کرنے کی ذرا بھی پرواہ نہیں قوت عملیہ اس درجہ ضعیف ہو رہی ہے اس درجہ اس میں خلل (۱) آگیا ہے اس قدر مختل ہو رہی ہے جس کا حساب نہیں۔ ایسی

(۱) فرق پڑ گیا ہے۔

ایسی خفیف حرکات کرتے ہیں جس سے افسوس ہوتا ہے۔ بہت سے معاصی ہیں کہ ان میں شب و روز مبتلا ہیں اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا، کسی کی چیز کو بلا اجازت اٹھالی، اور جہاں چاہا ڈال دی۔ کسی کی کتاب بلا اجازت لے لی اور ایسی جگہ رکھ دی کہ اس کو نہیں ملتی وہ پریشان ہو رہا ہے یا کسی سے کسی اچھے کام کا وعدہ کیا اور اس کے پورا کرنے کی اصلاً فکر نہیں۔ اس طرح سینکڑوں قصے ہیں کہاں تک بیان کئے جاویں۔

علم بے عمل بیکار ہے

لیکن باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی ان کے علم و فضل میں شک نہیں ہوتا، حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا کوئی ایسا کمال نہیں۔ یوں تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے۔ بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے۔ تفسیر میں وہ ماہر، حدیث میں وہ واقف، فقہ میں وہ کامل، کیا ہے جس کو وہ نہیں جانتا۔ اگر زیادہ نہ جانتا ہوتا تو علماء کو بہکا کیسے سکتا؟ جب کوئی شخص کسی فن میں ماہر ہوتا ہے جب ہی تو وہ اپنے سے کم جاننے والے کو دھوکا دے سکتا ہے۔ اس میں (یعنی شیطان میں) اگر کمی ہے تو صرف اسی بات کی ہے کہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔ چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے ایسا علم جو عمل کے لئے نہ ہو جہنم کا ذریعہ ہے۔ اس حدیث میں: ((لیجاری بہ العلماء ولیماری بہ السفہاء)) ''تاکہ فخر کریں ساتھ اس کے علماء اور مناظرہ اور جھگڑا کریں ساتھ اس کے سفہاء'' وغیرہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ایسے غافل ہو رہے ہیں کہ اپنی اصلاح کی ذرا فکر نہیں کرتے۔ بعض گو لوگ قصداً گناہ نہیں کرتے لیکن بے پرواہی کی وجہ سے ان سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی شکایت کے قابل ہیں۔

عبادت میں کوتاہی

اگر کوئی ملازم سرکاری بے پرواہی کرے اور کام خراب کر دے تو کیا اس

سے باز پرس نہ ہوگی؟ لوگوں نے عبادت کا سَت نکال لیا ہے، مثلاً بظاہر اُٹھ بیٹھ لئے اور نماز ادا ہوگئی، خصوصاً اہلِ علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے کہ سوائے ظاہری قیام، قعود کے اور بھی کچھ ہے اور وہ ضروری بھی ہے۔ جس قرآن میں: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ ﴾(۱) ہے اسی میں ﴿خٰشِعُوْن﴾(۲) بھی آیا ہے جب ﴿صَلَاتِهِمْ﴾ کے لفظ سے نماز کو مطلوب شرعی سمجھتے ہیں تو کیا وجہ ﴿خٰشِعُوْن﴾ سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح اور مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ خشوع بھی ویسا ہی ہے جیسے قیام ورکوع وغیرہ۔ اس غلطی کو دفع کرنا نہایت ضروری ہے کہ ایک کو تو ضروری سمجھیں اور دوسرے کو نہ سمجھیں، حالانکہ دونوں حکم یکساں ضروری ہیں۔ یہ خشوع ہی ہے جس سے عبادت اچھی ہوتی ہے۔ احسان اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

خشوع کی ضرورت واہمیت

احسان کے متعلق تین چیزیں ہیں اول: احسان کا ضروری ہونا، دوسرے: احسان کی حقیقت، تیسرے: تحصیلِ طریقِ احسان۔ اجمالاً اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ احسان خشوع سے حاصل ہوتا ہے اور خشوع کا مطلوب ہونا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ الخ سے معلوم ہو چکا ہے۔ اب اس کا ضروری ہونا سنئے۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾(۳)

(۱) ''بالتحقیق ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں'' سورۂ مؤمنون: ۱،۲ (۲) ''خشوع کرنے والے ہیں'' سورۂ مؤمنون: ۲ (۳) ''کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جاویں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاویں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہود ونصاریٰ) پھر (اسی حالت میں) ان ہر ایک زمانہ دراز گذر گیا (اور توبہ نہ کی) پس ان کے دل سخت ہوگئے'' سورۂ حدید: ۱۶۔

یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے۔اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آگئیں۔دیکھو عبادت میں خشوع نہ ہونے پر کیسی وعید ہے۔شکایت کی ہے اور یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے کہ ایسے نہ بنو۔اس سے ظاہر ہے کہ ترک خشوع کیسی بُری چیز ہے۔جس کے باعث سے کفار کے ساتھ آدمی مشابہ ہوجاتا ہے۔اور اسکا ثمرہ بیان فرمایا ہے:﴿فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾''پس ان کے دل سخت ہوگئے'' قساوتِ قلب نہایت بُری چیز ہے۔قساوت کی نسبت قرآن شریف میں ہے:﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(۱) ''یعنی تباہی اور ہلاکت ہے ان کو جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہورہے ہیں وہ لوگ کھلی کھلی گمراہی میں پڑے ہیں'' رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں''قلب قاسی خدا سے بہت دور ہے'' ان سب نصوص سے ثابت ہوا کہ قساوت بُری چیز ہے اور خشوع ضروری ہے۔لیکن خرابی یہ ہورہی ہے کہ لوگ خشوع کی حقیقت نہیں سمجھے اسی وجہ سے اس کی فکر بھی نہیں کرتے۔جو شخص کسی چیز سے واقف نہ ہوگا وہ اس کو حاصل کیا کرے گا۔عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خشوع کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آوے،ایسی مدہوشی ہوجاوے کہ تیر برچھا کچھ ہی لگے اس کی خبر نہ ہو پس انسان جماد(۲) کی طرح بن جاوے آدمیت سے گذر جاوے۔

کوئی پوچھے یہ معنی کہاں لکھے ہیں اور کس نے لکھے ہیں اس کا کچھ جواب نہیں۔اور واقعی کہیں بھی یہ معنی نہیں لکھے ہیں۔

---

(۱)سورۂ زمر:۲۲(۲)پتھر کی طرح۔

کتب تصوف کی اہمیت وضرورت

یہ شبہ کم فہم اور غیر شفیق واعظوں کی بدولت پڑا ہے۔ انہوں نے ایسی حکایتیں بیان کیں جن سے دھوکا میں پڑ گئے۔ پڑھے لکھے آدمی بھی اس سے ناواقف ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں اُن کے درس میں کوئی تصوف کی کتاب تو ہے نہیں، لیکن عام لوگوں کے سنانے کے لئے موجود ہوگئے۔ امراضِ قلبی اور امراض باطنی کے علاج کرنے پر آمادہ ہیں، وعظ ونصیحت کرنے پر مستعد ہیں۔ حالانکہ خود نہیں سمجھتے تو ایسے شخص کی مثال ہے جس نے نہ طب پڑھی نہ مطب کیا اور علاج کرنے لگا۔ علاج کے لئے پہلے طب پڑھنا ضروری ہے اور پھر مطب کرنا بھی لازمی ہے۔ بغیر اس کے قابلیتِ علاج نہیں آسکتی۔ ایسے ہی مدارس کی نسبت کسی نے کہا ہے ؎

اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَۃِ کُلُّ مَا حَصَلْتُمُوْہُ وَسْوَسَۃِ

علم نبود غیرِ علمِ عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی

''یعنی اے قوم جو کچھ تم نے مدرسۂ علم (لفظی) حاصل کیا وہ وسوسہ تھا۔ علمِ عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے''

جس طرح کنز وہدایہ ضروری ہے ویسے ہی ابوطالب مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ''قوت القلوب'' اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ''اربعین'' اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی ''عوارف'' کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ یہ تو گویا طب پڑھنا ہے اور اس کا مطب یہ ہے ؎

قال را بگذار مردِ حال شو پیش مردِ کاملے پامال شو

''قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو، یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑو''

علمِ باطنی کے حصول کی ضرورت

کیسی ناانصافی کی بات ہے کہ جب دس برس علمِ ظاہری کی تحصیل میں صَرف کئے تو دس ماہ تو باطن کی اصلاح میں صَرف کرو۔ اور اس کا یہی طریق ہے کہ کسی کامل کی صحبت میں رہو۔ اس کے اخلاق، عادات، عبادت کو دیکھو کہ غصہ کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے، شہوت کے وقت میں وہ کیسی حالت میں رہتا ہے، خوشامد کا اس پر کہاں تک اثر پڑتا ہے، اسی طرح تمام اخلاق کا حال ہے۔ کیونکہ پھر جب کبھی اس کو غصہ آئے گا تو سوچے گا کہ اُس کامل کی غصہ کے وقت کیا حالت ہوئی تھی ہم بھی ویسا ہی کریں۔ اس کے اخلاق وعادات پیش نظر ہو جائیں گے۔ یہ اس کا مطلب ہوا۔ چنانچہ کہا ہے ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی — تا راہ بیں نباشی کے راہ بر شوی
در مکتبِ حقائق پیش ادیب عشق — ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

''اے بے خبر کوشش کر کہ صاحب خبر ہو جائے جب تک راہ میں (راستہ دیکھنے والا) نہ ہوگا راہبر (راستہ دکھلانے والا) کیسے ہوسکتا ہے۔ اس لئے حقائق کے مدرسہ میں ادیبِ عشق کے سامنے کوشش کر کہ ایک نہ ایک روز باپ (یعنی مصلح) بن جائے گا''

جاہلانہ حکایات

ساری خرابی انہی ناعاقبت اندیش واعظوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ ایسی ایسی حکایتیں بیان کرتے ہیں جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عمل کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ اور جو کچھ کرتے ہیں ایسی حکایتوں کی وجہ سے اس کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

مثلاً طلبِ حلال کے متعلق یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حلال روزی کی طلب میں نکلے، ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جس کے پاس حلال روزی کی خبر لگی تھی اس نے جواب دیا کہ تھی تو میرے پاس لیکن چند روز سے حلال نہیں رہی۔ اتفاق سے میرا بیل دوسرے کے کھیت میں چلا گیا دوسرے کھیت کی مٹی اس کے پیر میں لگ کر میرے کھیت میں آ گری اس لئے روزی حلال نہیں رہی۔ محض مستبعد بات ہے۔ اول تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کے بَیل کھیت ہی میں ہمیشہ رہا کریں۔ باہر نکلنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور اگر ہو بھی تو اس سے کہیں حرمت آتی ہے، اور تمام امور سے قطع نظر کر کے اگر اس کی کوئی توجیہ بھی ہو تو اس بزرگ کی خاص حالت ہوگی عام تکلیف تو نہیں دی جاسکتی۔

اب ظاہر ہے کہ اس حکایت کو سن کر یہ خیال پیدا ہوگا کہ حلال روزی تو ممکن نہیں، اس لئے پھر خوب دل کھول کر حرام ہی کمایا جاوے۔ جس طرح ملے، چوری سے، دغا بازی سے، رشوت سے، سود سے سب لینا چاہیئے اور اسی طرح تباہ ہوجاتے ہیں۔ ایسی باتیں بیان کرنے سے ان کی غرض ہوتی ہے کہ وعظ میں ذرا رنگ آجاوے۔ نئی بات ہونے کی وجہ سے لوگوں کو پسند آئے۔ خوب واہ واہ ہو، شریعت میں ہرگز ایسی تنگی نہیں ہے۔

بخیل کا حال

ایسی تنگی کی تو ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک بخیل صاحب کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ بے چراغ بجھائے ہوئے نماز پڑھنے کو مسجد میں چل کھڑے ہوئے، راستے میں یاد آیا کہ یہ فضول خرچی ہے۔ لَوٹ کر چراغ گل کرنے آئے، لَونڈی نے پوچھا خیر تو ہے، حضور کیسے لَوٹ آئے؟ اتنی فضول خرچی ہوئی کہ آپ کے

یہاں تک لَوٹ کر آنے میں جوتا گھس گیا ہوگا۔ بڑے خوش ہوئے اور جواب دیا کہ چراغ جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا اس کے بجھانے کو آیا ہوں۔ اُس نے جواب دیا کہ میں نے پہلے ہی گل کر دیا تھا۔ وہ بولے شاباش کہ تو بڑی محتاط ہے، اور تجھے فکر ہے کہ کوئی فضول خرچی نہ ہو حتی کہ میرے جوتا گھسنے کا بھی خیال ہے لیکن سمجھ لے کہ میں نے لَوٹتے وقت جوتا اُتار کر بغل میں دبالیا تھا لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ ۔ شریعت ایسی مہمل باتوں سے پاک ہے ایسی تنگی اس میں کہاں۔

غلط علاج

بلکہ جب حلال صورتیں بکثرت بتلائی جائیں گی توفیق عمل کی ہوگی، حلال روزی کی فکر کریں گے۔ سمجھ لو کہ ہدایہ وکنز وغیرہ میں جو جو چیزیں حلال لکھی ہیں وہ بلاشبہ حلال ہیں اس میں ذرا شک نہیں۔ بات کیا ہے کہ اہلِ باطن جو مغلوب الحال تھے یہ اُن کی حکایتیں ہیں، عوام کے سامنے اُن کو بیان کر دیا۔ یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ ایک شخص کو دست کا عارضہ تھا، حکیم صاحب نے اُن کے لئے دہی خشکہ (۱) تجویز فرمایا۔ اور ایک شخص کو ضعف دماغ تھا (۲) اس کے لئے مقوی (۳) چیزیں گوشت، یخنی، دودھ، قورمہ تجویز کیا۔ اب اگر دست والا سن کر اس پر عمل کرنے لگے تباہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا، مرے گا۔

اسی طرح جو حالات بیان کئے تھے سچ تھے، لیکن یہ کس کے تھے اہلِ باطن کے لئے، یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات بیان کر ہی دی جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی خشوع ہے اور یہی بڑا کمال ہے کہ تیر بھی لگے تو خبر نہ ہو، حالانکہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز

(۱) دہی اور سادہ چاول کھانے کیلئے بتائے تھے (۲) دماغ کمزور تھا (۳) طاقت ور چیزیں۔

کو ذرا طویل کروں لیکن کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان ہو جائے گی۔

خشوع کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی مثال

اب بتلایئے کہ یہ کمال کی حالت ہے یا وہ، تیر کی خبر نہ ہونا بھی ایک حالت ہے جسے استغراق و محویت کہتے ہیں لیکن وہ خشوع نہیں ہے۔ نماز کے معنی اگر کوئی بیان کرے کہ صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک نہ کھانا تو یہ غلط ہے اگرچہ نماز بھی کوئی چیز ہے لیکن یہ نماز نہیں ہے اسی طرح یہ حالت ہے تو ضرور لیکن یہ خشوع نہیں ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کہ ایک مرتبہ مقدمہ پیش ہوا، مدعا علیہ نے گواہ پر جرح کی کہ نماز نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا واہ صاحب میں تو حج بھی کر آیا ہوں۔ قاضی نے اس سے پوچھا کہ اچھا بتلا زمزم کیا چیز ہے اور عرفات کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ زمزم ایک بوڑھا آدمی ہے اور عرفات ایک باغ ہے جس میں وہ بوڑھا بیٹھا ہوا ہے۔ قاضی نے کہا کہ کیا غلط کہتا ہے فضول بکتا ہے ہم نے خود حج کیا ہے زمزم ایک کنویں کا نام ہے اور عرفات ایک جنگل ہے۔ اس نے کہا جب میں گیا تھا اس وقت تو یہی تھا آپ کے جانے کے وقت بدل گیا ہوگا۔

خشوع کے معنی یہ کہنا کہ کچھ خبر نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے کاذب نے کنویں اور عرفات کی حقیقت بیان کی تھی۔

استغراق و محویت کا انکار درست نہیں

ہاں اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ بھی ایک حالت ہے۔ جیسے عرفات و زمزم کا وجود واقعی تھا، گو جو وہ کہتا تھا نہ تھا گو بعض لوگ سرے سے اس حالت کا بھی

انکار کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ یہ امر خلافِ فطرت ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص نماز پڑھتا ہو اس طرح کہ اس کو تیر لگنے کی خبر نہ ہو۔اس منکر کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی مادر زاد عنین لذتِ جماع کا انکار کرے، یا کوئی مادر زاد اندھا کہے کہ لوگ جس کو دیکھنا کہتے ہیں وہ کوئی چیز نہیں ہے۔حالانکہ ایسے واقعات ثابت ہوئے ہیں۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حدیث شریف کا بیان کررہے تھے اُن کی آستین میں کہیں سے کمبخت ایک بچھو گھس گیا وہ ڈنگ مارتا تھا جس کے صدمہ سے ان کا چہرہ متغیر ہوجاتا تھا لیکن اُف نہیں کرتے تھے اور برابر حدیث شریف کا بیان کرتے رہے۔ حتی کہ گیارہ بار اس نے نیش زنی (۱) کی۔جب گھر میں آکر کُرتا اُتارا تو کُرتے میں خادم نے بچھو کو دیکھ کر عرض کیا کہ آپ نے اس وقت کیوں نہیں اظہار فرمایا۔جواب دیا کہ مجھے شرم آئی کہ حدیث شریف کے وقت دوسری طرف متوجہ ہوں۔

لیکن باوجود اس کے خشوع کے یہ معنی نہیں کہ دوسرا خیال نہ آوے۔جو شخص خشوع کی حقیقت نہ سمجھے گا سخت غلطی میں مبتلا ہوگا۔سمجھے گا کہ دوسرا خیال تو رُک سکتا نہیں اور بندہ خشوع کا ہے مکلّف اس لئے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲) ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے'' میں شک کرنے لگے گا۔ایسی حکایتوں سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔

خشوع کی حقیقت و معنی

اب چاہیئے کہ خشوع کی حقیقت کو خوب سمجھ لیجئے۔پہلے لغت کے موافق اس کے معنی بیان کئے جاتے ہیں پھر شرعیات سے اس کی تائید کردی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوجائے گا کہ خشوع کیا چیز ہے۔خشوع کے معنی ہیں دَب جانا پست

(۱) ڈنگ مارا (۲) سورۂ بقرہ:۲۸۶۔

ہوجانا، یعنی سکون جیسا کہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾(۱)

''یعنی منجملہ اس کی (قدرت اور توحید کی) نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ (اے مخاطب) تو زمین کو دیکھ رہا ہے کہ دبی دبائی پڑی ہے۔ پھر جب اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے''

چونکہ ﴿اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ سے ﴿خَاشِعَةً﴾ کا مقابلہ کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اھتز از اور اُبھرنے میں حرکت ہے تو ﴿خَاشِعَةً﴾ کے معنی سکون اور پستی والی کے ہوں گے اور مقابلہ سے ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں (۲) خود لغت شاہد ہے (۳) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر شے کا حرکت وسکون جدا گانہ ہوتا ہے۔ اگر کہا جاوے کہ ہاتھ چل رہا ہے تو اس کے معنی ہلنے جلنے اور نقل مکانی کے ہوں گے۔ اور اگر کہا جائے کہ فلانے کی طبیعت خوب چلتی ہے تو یہاں یہ معنی نہیں مراد ہوں گے بلکہ یہاں اور معنی ہوں گے یعنی فکر کرنا اور سوچنا، جب یہ معلوم ہوگیا تو اب سنئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو دو قسم کی چیزیں عنایت فرمائی ہیں ظاہر اور باطن، یا یوں کہو کہ جوارح (۴) اور قلب (۵)۔ پس کمال خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ جوارح بھی ساکن رہیں اور قلب بھی۔ لیکن دونوں کا سکون جدا جدا ہے۔ جوارح کا سکون تو یہ ہے کہ ادھر اُدھر دیکھے نہیں ہاتھ پَیر نہ ہلائے۔ اور اس کے مقابلات کا نام حرکت ہوگا۔ (۶) اور قلب کا سکون اس کی حرکت کے مقابل ہے حرکت تو یہ ہے کہ خیال کرنا، تصور کرنا، فکر کرنا یعنی سوچنا، اور سکون اس کا عدم ہے (۷) اور ظاہر ہے کہ فکر

---

(۱) سورۂ فصلت: ۳۹ (۲) بالکل ضرورت نہیں (۳) خود لغت بتارہی ہے (۴) اعضاء (۵) دل (۶) اِدھر اُدھر دیکھنے اور ہاتھ پیر ہلانے کا نام حرکت ہوگا (۷) نہ سوچنا، نہ تصور کرنا وغیرہ۔

کرنا اور سوچنا فعل اختیاری ہے اور قدرت اور اختیار ضدین سے متعلق ہوتا ہے(۱)۔ پس جب یہ حرکت اختیاری ہے تو اس کے مقابل سکون بھی یعنی سوچنا اختیاری ہوگا۔ اور آدمی اختیاری ہی چیزوں میں مکلّف ہوتا ہے۔ لہذا خشوع کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے اختیار سے دوسرا خیال نہ لانا یہ نہیں کہ دوسرے خیال کا دل میں نہ آنا۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، خیال کا آنا تو اختیاری نہیں ہے اور خیال کا لانا اختیاری ہے۔

وسوسہ کا آنا بُرا نہیں لانا بُرا ہے

پس خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ اپنے اختیار سے دوسرے خیالات دل میں نہ لاوے۔ رہا اگر کوئی خیال بلا اختیار آوے تو وہ خشوع کے منافی نہیں۔(۲)

رسول اللہ ﷺ سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ میرے دل میں ایسے ایسے خیال آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہوجانا ان سے آسان معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَوَجَدْتُّمُوْهُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ! قَالَ: ذٰلِكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ)) یعنی آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اس کو پایا ہے یعنی کیا ایسے خیالات تمہیں آتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو صریح ایمان ہے، اور کیوں نہ ہوں چور تو وہیں آتا ہے جہاں مال ہو متاع ہو۔

شیطان ایمان والے کے پاس ہی آئے گا

اسی طرح شیطان وہیں آتا ہے جہاں متاعِ ایمان ہو۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

(۱) قدرت اور اختیار کا تعلق دونوں جانبوں سے ہوتا ہے یعنی جس کا کرنا اختیاری اس کا نہ کرنا بھی اختیاری ہوگا (۲) اس سے خشوع میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دیو آید سُوئے انساں بہر شر پیش تو ناید کہ از دیوے بتر

''شیطان تو انسان کی طرف شر کے لئے آتا ہے تیرے پاس نہ آئیگا کہ شیطان سے بدتر ہے''

شیطان بڑا استاد ہے اپنا وقت فضول ضائع نہیں کرتا، جو خود شیطان بن گیا ہے اس کو بہکانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہاں جس میں کچھ ایمان باقی ہے اسی کی فکر میں رہتا ہے۔ اپنی دُھن کا پکا ہے۔ ایمان داروں ہی کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ ہم لوگوں کو تو اس سے خاص صفت میں سبق حاصل کرنا چاہیئے تھا۔

ایک چور نہایت نامی تھا، ہمیشہ چوری کیا کرتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ سُولی دیدی گئی۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے دوڑ کر اس کے پَیر چوم لئے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ اس کی استقامت قابلِ تعریف ہے۔ اگر ہم خدا کی اطاعت میں ایسی استقامت کریں تو ہمارے مدارج کا کہیں ٹھکانا ہی نہ رہے۔ (۱)

وساوس کا علاج

اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے اور وسوسہ اور خیالات کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیئے بُرے بُرے خیالات جن پر عمل نہ ہو مگر طبیعت منقبض ہو، الجھے (۲) بزرگوں ہی کو آتے ہیں۔ فاسقوں کو ایسے خیالات نہیں آتے، اور ان وساوس سے پریشانی کا باعث یہی ہے کہ کسی طبیب قلب کی صحبت نہیں نصیب ہوئی (۳)۔ اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو کہہ دیتا کہ اگر وسوسے آتے ہیں تو آنے دو کچھ پرواہ نہ کرو۔ قلب کی حالت تو شاہی سڑک کی سی ہے۔ کہ اس پر حاکم، رئیس اور ادنی چمار (۴) دونوں گذرتے چلے جاتے ہیں۔

(۱) ہمارے درجات کی بلندی کی کوئی حد نہ ہو (۲) بُرے خیالات جن پر عمل نہ ہو لیکن طبیعت اس سے گھبرائے (۳) دل کی اصلاح کرنے والے ولی کامل کی صحبت میسر نہیں آئی (۴) کم درجہ کا بھنگی۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیانِ شاخِ برزخ لا یبغیاں

''بحرِ تلخ اور بحرِ شیریں دونوں برابر جاری ہیں، مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے''

شیطان کی حالت کتے کی سی ہے۔ کتا بھونکا کرے اور التفات(۱) نہ کیا جائے تو آپ چپ ہوجاتا ہے، اور اگر اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کو دفع کرنا چاہے تو اور زیادہ غصہ کرکر کے بھونکتا ہے۔ اسی طرح وساوس شیطانی کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ کیونکہ شیطان سے جو دبتا ہے اور اس کا خیال رکھتا ہے اس کے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ وسوسے پر جو غمگین ہوگا وہ سخت پریشان ہوگا۔ بلکہ جب وسوسہ آئے تو اور خوش ہونا چاہیئے کہ الحمدللہ دولتِ ایمان موجود ہے اگر آدمی میں قوت توکّل اور اعتماد علی اللّٰہ (اللہ پر بھروسہ) کی صفت ہو تو ایک شیطان کیا اگر لاکھ شیطان ہوں تو کچھ نہیں بناسکتے۔ ہاں قصداً خیال کا لانا بیشک منافی خشوع اور حضورِ قلب کے ہے۔(۲)

خیالات سے پیچھا چھڑانے کا طریقہ

اب اس تقریر سے ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ خشوع اور حضورِ قلب اختیاری ہے اور نہایت آسان ہے لیکن تاہم جب تک طریق نہ معلوم ہو اور اس پر عمل نہ کیا جاوے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ کپڑا سینا آسان ہے ہر شخص جانتا ہے کہ کیسے کپڑا سیتے ہیں، لیکن سینا جب ہی آسکتا ہے کہ کسی درزی سے طریق سیکھا جائے اور اُس پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح حضورِ قلب کا حال ہے، اُس طریقے کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ مسئلہ عقلی ہے کہ (اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَاحِدٍ)

(۱) اس کی طرف توجہ نہ کی جائے (۲) البتہ ارادۃً خیال کا لانا بیشک خشوع کے خلاف اور دل سے نماز کی طرف متوجہ ہونے کے خلاف ہے۔

''نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا'' یعنی پوری توجہ ایک ہی چیز کی طرف ہوا کرتی ہے۔ ایک وقت میں اگر دو چیزیں خیال میں ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ دونوں میں سے کسی کی طرف بھی پوری توجہ نہیں۔ یا دو چیزیں نظر آتی ہوں تو توجہ کامل دونوں میں سے کسی کی طرف بھی نہیں۔ جس چیز کو آدمی گھورتا ہے اسی کی طرف دیکھنے میں توجہ ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ طریقہ یہی ہے کہ ایک خیال رکھیں تو دوسرے خیالات خود دفع ہوجائیں گے اور کوئی خیال نہ آئے گا۔ کیونکہ اگر یہ کوشش کی جاوے کہ ایک ایک کرکے خیالات دفع کئے جاویں تو سخت دشواری پیش آئے گی اور دفع ہوجانا ناممکن ہوجائے گا۔ کیونکہ اول تو دیکھی ہوئی چیزیں انسان کی بکثرت ہیں۔ پھر علاوہ اس کے انسانی قوتِ متفکرہ یا متخیلہ ان کو ترکیب دے دے کر بے تعداد فرضی صورتیں اختراع کیا کرتی ہے۔ (۱) مثلاً آپ نے دوسر کا آدمی کبھی نہیں دیکھا ہوگا لیکن یہ قوتِ متفکرہ ایک دھڑ اور دوسر کو جوڑ کر خیالی صورت بنا کر سامنے کھڑا کردیتی ہے۔ اور انسان کو معلوم ہونے لگتا ہے کہ دوسر کا آدمی ایسا ہوسکتا ہے۔

بہرحال ایک ایک خیال کو دفع کرنا بہت دشوار اور بڑی ہی مصیبت ہے۔ کبھی بھول کر بھی خیالات دفع کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ پس اس کا طریقہ یہی ہے کہ کسی نیک چیز کی طرف دھیان لگادو، اس دھیان کے باندھتے ہی سارے خیالات خود بخود ہٹ جائیں گے۔ بعض سالکین نے ناواقفی کے باعث ہجوم وساوس سے پریشان ہوکر خودکشی کرلی ہے۔ یہ کیوں، اس لئے کہ یا تو ان کو شیخ نہیں ملا یا شیخ کی تعلیم کی قدر نہیں کی۔ شیخ، جس پر یہ امور گذرے ہوتے ہیں جانتا ہے

(۱) انسان کی فکری اور خیالی قوت دو چیزوں سے تیسری چیز گھڑ لیتی ہے اور اس طرح سینکڑوں شکلیں دماغ میں جمع ہوجاتی ہیں۔

اور بتلاسکتا ہے۔ایسی پریشانی کی حالت کو قبض کہتے ہیں۔اس میں عبادت میں بھی مزہ نہیں آتا اور جی گھٹتا ہے، اور جی گھٹنے کی وجہ یہ ہے کہ لذت نہیں ملتی۔ہم لوگوں کی عجیب حالت ہے عبادت بھی ایسی کرنا چاہتے ہیں جس میں حظِّ نفسانی ملے(۱) عبادت بھی چاہتے ہیں تو مزیدار۔حالانکہ مزہ مطلوب نہیں ہے بلکہ تعبد مطلوب ہے(۲)۔البتہ مزے سے عبادت سہل ہوجاتی ہے۔

طالب کا حال

غرض طالب کی یہ حالت ہونی چاہیئے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش اگر ریش بیند وگر مرہمش

''اس کے غم کے پریشان لوگوں کا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں''

گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

''ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اور اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے''

دمادم شرابِ الم درکشند اگر تلخ بیند دم در کشند

''ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہورہتے ہیں''

اگر مرد عشقی گم خویش گیر وگرنہ رہِ عافیت پیش گیر

''اگر عاشق ہے تو محبوب کے عشق میں خود کو فنا کر، ورنہ اپنی آسائش کی راہ اختیار کر''

(۱) جس میں نفس کو مزہ آئے (۲) عبادت گذاری مطلوب ہے۔

مترس از محبت کہ خاکت کند کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

''مت ڈر کہ محبت تجھ کو خاک کردے گی اس لئے کہ اگر تجھ کو ہلاک کریگی تو بقائے جاودانی تجھ کو عطا کرے گی''

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

''جس کو عشق سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کو لذتِ قرب علی وجہ الکمال حاصل ہوجاتی ہے اس لئے اس کو مردہ نہ کہنا چاہئے''

باغباں گر پنج روزے صحبتِ گل بایدش بر جفائے خارِ ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال مُرغ زیرک گر بدام افتد تحمل بایدش

''باغبان کو اگر صحبتِ گل کی خواہش ہے تو اس کو بلبل کی طرح ہجر کے کانٹوں کی اذیت پر صبر کرنا چاہیئے اے دل محبوب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر پریشانی سے گریہ وزاری مت کر۔ سمجھدار پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر وتحمل چاہیئے''

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

''محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں''

پس زبونِ وسوسہ باشی دلا گر طرب را بازدانی از بلا

''پس بُرا وسوسہ ہوا ے دل اگر خوشی کو بلا سے جدا جانے''

ہمت والوں کا تو یہ قول ہے ؎

روز ہا گر رفت گورو پاک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

''ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیئے اگر گئے بلا سے، عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ہونا کافی ہے''

تم لذت کی کچھ فکر نہ کرو، کام کئے جاؤ، لذت نہ آئے بلا سے نہ آئے۔حضورِ قلب کا طریق کلی طور پر تو معلوم ہوگیا۔

نماز میں دل لگانے کے طریقے

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سی شے ہے جس میں دل لگایا جائے۔اس کے دو طریق ہیں، ایک تو مشہور ہے جو لوگوں نے ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) ''اللہ تعالی کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے'' سے سمجھا ہے۔لیکن میرے نزدیک یہ سمجھنا صحیح نہیں۔اور اس کا بیان آگے آویگا۔

دوسرا طریقہ

(جو استاد علیہ الرحمۃ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بتلایا تھا اور الحمدللہ کہ ایک حدیث سے بھی میری سمجھ میں آ گیا اور تجربہ بھی اس کے مفید ہونے پر شاہد ہے) یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس طرح کہ ((مُقْبِلاً عَلَیْھَا بِقَلْبِہٖ)) یعنی حال یہ ہو کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے۔

ہر لفظ سوچ سوچ کر پڑھنے سے نماز میں دل لگے گا

اب نماز، دیکھنا چاہیئے کہ نام کس کا ہے۔ سو اس میں بعضے چیزیں تو مختلف ہیں ان کی طرف توجہ کرنے سے مبتدی کو یکسوئی حاصل ہونا ذرا تکلف ہے۔ اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس میں ایسی کونسی چیز ہے جو نماز میں برابر ہوتی رہتی ہے۔ سو وہ ذکر اللہ ہے کہ ابتداء سے انتہا تک پایا جاتا ہے۔

تو اب نماز میں متوجہ ہونے کی صورت اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی کہ ذکر اللہ کی طرف برابر توجہ رہے۔ یعنی جو کچھ پڑھا جاوے سوچ سوچ کر پڑھا جائے۔ پہلے سوچ لو پھر زبان سے نکالو یہ نہیں کہ ریل گاڑی ہے جہاں ڈرائیور نے گل (۱) چلادی اور گاڑی اُڑی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسٹیشن آ گیا اور ڈرائیور نے روکی تو تھمی۔ اس طرح سے اپنے اندر کی ریل گاڑی کو اگر ہم چلائیں گے تو لڑے گی۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا کہ سارے قوائے محمودہ کے مسافر پاش پاش ہوجائیں گے اور زمینِ باطل میں ہلچل پڑ جائے گی۔ دنیاوی ریل کے لڑنے کا حال تو اسی وقت آنکھ سے نظر آجاتا ہے ہماری اندرونی ریل کے لڑنے کا حال قیامت میں کھلے گا۔

بہرحال چاہیئے کہ ہر ہر لفظ کو سوچ سوچ کر پڑھو۔ اگرچہ اس میں دو چار دن مشقت معلوم ہوگی جی گھبرائے گا، کیونکہ جی روکنا پڑے گا، لیکن جہاں ہم اپنے دنیاوی ذرا ذرا سے کاموں میں مشقت اٹھاتے ہیں تو خدا کے لئے بھی ذرا سی مشقت اٹھانا گوارا کریں، جب دنیا بے مشقت نہیں ملتی تو خدا کو چاہتے ہو کہ بے مشقت ہی مل جائے۔

---

(۱) بٹن دبا دیا بس گاڑی چلنی شروع ہوگئی۔

حضور ﷺ کی تعلیم کی خوبی

رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے قربان جایئے کیسے چھوٹے چھوٹے لفظوں میں اتنے بڑے بڑے دشوار کلام کو آسان کر کے بتلا دیا اور کیوں نہ ہو: ((عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَاَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِیْ)) ''اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تعلیم دی پس بہترین ہے میری تعلیم، اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ادب سکھایا پس بہترین ہے میری تادیب'' یہ خدا کی تعلیم ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

'' آپ ﷺ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے، اگرچہ ایک اللہ کے بندے (یعنی محمد ﷺ) کے منہ سے ادا ہوا ہے''

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاذ ازل گفت ہما میگویم

''پسِ پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے، مجھے جو حکم استادِ ازل سے ملا تھا وہی کہہ رہا ہوں''

حضورِ قلب کا طریقہ

اس کے علاوہ ایک مشہور طریق حضورِ قلب کا وہ ہے جو حدیث: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ)) سے لوگوں نے سمجھا ہے۔ یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں، اور اگر یہ نہ ہو تو یہ سمجھے کہ خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پس گویا دو طریق متقابل ہیں۔

مضمونِ حدیث کی تفہیم میں ایک غلطی کا ازالہ

لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ اول تو لفظوں کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ سوال حقیقتِ احسان سے ہے نہ طریقِ تحصیل احسان سے ہے۔ چنانچہ جو جواب دیا گیا ہے اس میں احسان کی حقیقت بتلائی ہے نہ کہ طریق، چنانچہ اس کے قبل بھی اسلام اور ایمان کی حقیقت ہی سے سوال وجواب کا ہونا اس کا اور بھی مؤید ہے، دوسرے تجربہ بھی شاہد ہے کہ تصور رؤیت حق حضورِ قلب کے لئے عموماً اور خصوصاً مبتدی کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ کیونکہ طبیعت پریشان ہوتی ہے کہ خدا کو کیسا سمجھوں۔ اور ایک صورت سمجھ میں آتی ہے پھر اس کا دفع کرنا ہے۔ اسی طرح پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو کبھی دیکھا نہیں اس کا تصور کیسے جم سکتا ہے۔ البتہ منتہی کو خدا کے دیکھنے کا تصور بے کیف ذوقی طور پر میسر ہوجاتا ہے۔ اور طریقہ عام ہونا چاہئیے۔ علاوہ بریں اگر مضاف محذوف مان کر (یعنی طریقہ ان الخ) سے طریق ہی قرار دیا جاوے تو تقابل ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیونکہ ((کَاَنَّكَ تَرَاهُ)) کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر تم اسے دیکھتے نہ ہو تو بیشک وہ تمہیں دیکھتا ہے۔ سو یہ مضمون جملہ اولی کے ساتھ جمع ہورہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم ایسی عبادت نہ کرسکو کہ گویا اسے دیکھتے ہو (تو یہ سمجھو) کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے بہر حال یہ طریق الفاظ حدیث اور تجربہ دونوں کے خلاف ہے۔ پس اس حدیث میں حقیقتِ احسان کا بیان ہے، طریق مذکور نہیں۔

حدیث کے معنیٰ کی وضاحت

رہا حدیث کے معنی کیا ہیں تو اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کام کررہا ہو اور اسے معلوم ہوجائے کہ اس وقت ہمارا مالک اور حاکم دیکھ رہا ہے تو وہ شخص کام بالکل ٹھیک کرنے لگے گا۔ اور احتیاط رکھے

گا کہ کوئی خرابی نہ ہونے پائے۔ اور اگر کہیں خود حاکم کو دیکھ لیا تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ اپنی انتہائی کوشش صَرف کر کے کام کو خوب اچھی طرح انجام دے گا۔ چنانچہ طالب علموں ہی کو دیکھ لیجئے کہ استاد کی عدم موجودگی میں آپس میں بیٹھتے ہیں تو ظرافت اور ہنسی کی باتوں میں بھی باک نہیں ہوتا۔(۱) دل کھول کر ایک دوسرے سے بولتے ہیں، کہیں پَیر پھیلائے ہیں، کہیں کوئی شعر پڑھ رہے ہیں۔ اور جہاں کسی نے دیکھ لیا کہ مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں فوراً مؤدب ہوکر بیٹھ گئے اور خاموشی اختیار کرلی۔ اور کہیں اپنی نظر استاد پر پڑ گئی تب تو ادب کا ٹھکانا ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ حاکم کی نظر کے سامنے ہونے کے وقت کام خوب عمدگی سے ہوتا ہے، تو مطلب اس حدیث کا یہ ہوا کہ خدا کی ایسے حسن وخوبی سے عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو (یعنی اگر فرضاً تم خدا کو دیکھتے تو سوچو اس وقت تمہاری عبادت کس طرح کی ہوتی، اب بھی اسی حالت کے مشابہ تمہاری عبادت ہونی چاہیئے) اس لئے کہ اگر تم اسے نہ بھی دیکھتے ہو تو کیا ہوا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے (یہ اس لئے بڑھایا کہ پہلے جملے سے یہ سوال ہوسکتا تھا کہ جب واقع میں ہم نہیں دیکھتے تو اس طرح کی تحسین عبادت کس طرح ممکن ہے، اس کا جواب اس سے مفہوم ہوگیا کہ دیکھنے والے کی تحسین عبادت کے لئے حق تعالیٰ کی رؤیت کا تعلق بھی کافی ہے) غرض ((فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ)) ''پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے'' میں فائے تعقیب نہ لی جائے، بلکہ فائے علت قرار دی جائے۔

خشوع کی اقسام

یہاں تک تو آپ کو خشوع کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی۔ اس کا ضروری ہونا

(۱) کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

بھی ثابت ہوگیا۔ طریقہ سے بھی واقفیت حاصل ہوچکی۔

اب خاتمہ کے طور پر ایک امر اور بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس خشوع کے پیدا کرنے کا وقت کونسا ہے۔ آیا ہر وقت خشوع ہی کے اہتمام میں رہیں یا اس کا کوئی خاص وقت ہے، تو اب سنئے کہ ایک خشوع تو مستحب ہے اور دوسرا واجب ہے۔ مستحب تو یہ ہے کہ ہر وقت یہی حالت استحضار کی قلب پر غالب رہے۔ لیکن یہ ہر شخص کے لئے نہیں ہے۔ صرف اسی کو جائز ہے جس کی ایسی حالت نہ ہو کہ نہ تو خود اس کی ضروریات میں مخل ہو، نہ کسی دوسرے کی حق تلفی کا باعث ہو ورنہ تباہی کی نوبت آجائے گی۔ مستحب کے لئے واجبات ترک ہونے لگیں گے، بجائے ثواب کے اُلٹا وبال ہوجائے گا۔

خشوع میں غلو

مثلاً اگر کسی کی بی بی آٹے کے لئے پیسے دے کہ آٹا لے آؤ بچے بھوکے ہورہے ہیں اور وہ لگے رہیں خشوع حاصل کرنے میں جس کی وجہ سے بچے بھوکے مریں، تو ایسا خشوع موجبِ قرب نہیں ہوسکتا۔ خدا سے دوری کا باعث ہوگا۔ حکایت ہے کہ ایک ولایتی صاحب کسی مسجد میں ٹھہرے تھے۔ جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ ایک مسافر جو وہاں سورہا تھا خراٹے لے رہا ہے۔ آپ نے اس کو کئی دفعہ تو اٹھا اٹھا کر بٹھادیا اور کہا کہ تم کس طرح سوتے ہو ہمارے خشوع میں خلل پڑتا ہے۔ وہ بے چارہ تھکا ہوا تھا پھر سوگیا۔ آپ کو جو غصہ آیا چُھرا نکال کر اس کا کام تمام کردیا۔ اچھا خشوع حاصل کیا کہ بے چارے کی جان ہی لے ڈالی۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنی بی بی بچوں کو تباہ کررکھا ہے۔ اور اس خبط میں مبتلا ہیں، دائمی حضورِ قلب اور خشوع کے پیچھے حق تلفیاں کرتے ہیں۔

یہ امر نہایت نازیبا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوگئی کہ کسی نے نوکر سے کہا ہم بھوکے ہیں کھانا لاؤ، وہ بجائے کھانے کے دوڑ کر برف سے ٹھنڈا کر کے پانی لے آیا اور اسی پر اصرار کرتا ہے کہ نہیں جناب پانی ہی پیجئے بہت ٹھنڈا ہے، کھانا نہ کھایئے تو ایسے نوکر سے مالک خوش ہوگا یا ناراض۔ جیسے ایک صاحب کا نوکر تھا اس سے مانگا خلال وہ اٹھالایا بانس، مانگا لحاف وہ اٹھالایا گھوڑے کا چار جامہ اور اصرار کرتا ہے کہ لو اسی کو اوڑھ لو۔ یہ گستاخی ہے یا نہیں۔

خودرائی کی بُرائی

یہ ساری خرابیاں خودرائی کی ہیں، خودرائی بھی بڑی مضر شئے ہے (۱)۔

فکرِ خود ورائے خود در عالم رندی نیست کفر است دریں مذہب خود بینی وخودرائی

''اپنی رائے اور فکر کو راہِ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے اس طریق میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے''

مناسب تو یہ ہے کہ ایسا ہوجائے ؎

چوں قلم درپنجۂ تقلیبِ رب (۲)

یہاں تو جو حکم ہو وہ ہی کرو، یہی کمال ہے، مثلاً اگر کسی کو پائخانہ زور سے لگا ہو اور وہ نماز پڑھنا چاہے تو بُرا ہے۔ چاہیئے کہ پہلے فارغ ہوجائے پھر نماز پڑھے۔ اگر کوئی اصرار کرے اور کہنے لگے کہ صاحب نماز پڑھنا تو عبادت ہے اور پیشاب پائخانہ تو نجاست کا کام ہے میں تو نماز ہی پڑھوں گا، تو وہ بے جا کرتا ہے۔ اس طرح نماز کا بھی ستیاناس کرے گا۔

---

(۱) نقصان دہ چیز ہے (۲) جیسے قلم تقدیر پروردگار کے ہاتھ میں۔

خشوع کس کے لئے کس درجہ میں ہے

خلاصہ یہ کہ اس مرتبہ خشوع کا اہتمام اس کے لئے ہے جس سے اس کے باعث نہ تو کسی کا حق تلف ہو، نہ دین کا ضرر ہو اور نہ کسی کو دنیا کا ضرر پہنچے۔ دین کے ضرر کی صورت یہ ہے کہ کوئی طالب علم ہے کہ رات کو تو خشوع پیدا کرتا رہے، مطالعہ دیکھا نہیں، صبح کو جب سبق پڑھنے بیٹھے تو کچھ سمجھ میں آتا نہیں آخر بے دلی سے پڑھ پڑھ کر کتابیں تمام کیں۔ نہ کچھ آیا نہ گیا۔ علمِ دین جیسی ضروری چیز سے محروم رہا۔ بلکہ ناقص سے لوگوں کا مقتدا بن کر تباہ کرنا شروع کیا۔ دُنیا کا ضرر یہ کہ بال بچے جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی ہونے لگی۔ اسی طرح ترکِ اسباب ظاہری اگرچہ مستحب ہے لیکن اسی کے لئے جس کی وجہ سے اہل وعیال کے حقوق کے ادا کرنے میں کمی نہ ہونے پائے ورنہ نہیں۔

کسبِ معاش سے بے فکروں کو حُبِ الٰہی میں غرق ہونا چاہیئے

لیکن ہاں جسے کسی کی فکر نہ ہو اور وہ بھی اس مرتبہ کی تحصیل سے غافل ہے تو بڑا ظلم ہے۔ ایسے ہی شخص کے بارہ میں ہے ؎

ہر آنکہ غافل از حق یکزمان است   دراں دم کافر است امانہان است

”جو شخص اس سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی میں کافر ہے لیکن نہاں ہے“

حضوری گرہمی خواہی از وغافل مشو حافظ   متی ما تلق من تھوی دع الدنیا وامھلھا

”اگر محبوب حقیقی کے دربار کی حضوری اور قرب چاہتے ہو تو اس سے غافل مت ہو، بلکہ اس کی طرف متوجہ رہو، اور جب اپنے محبوب سے ملاقات کرو، یعنی اس کی عبادت میں مشغول ہو تو دنیا اور مافیہا کی طرف التفات مت کرو“۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند وخم طرۂ یاری گیرند

''میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ یار لوگ تمام کاموں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کے تصور میں لگ جائیں''

جملہ اوراق و کتب در نارکن سینہ را از نور حق گلزار کن

''تمام اوراق وکتابیں آگ میں جلادو اور سینہ کو اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن کرو''

ستم ست اگر ہوست کشد کی بسیر سرودوسمن درا
تو زغنچہ کم ندمیدۂ دلِ درکشا بچمن درا

''تمہارے اندر خود چمن ہے اس کو پھاڑ کر تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرو''

آسمانہا ست در ولایتِ جاں کار فرمائے آسمانِ جہاں
در رہِ رُوح پست وبالا ہاست کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

''ولایتِ جان میں بہت سے آسمان ہیں جو آسمانِ دنیا میں کارفرما ہیں روح کی راہ میں نشیب وفراز اور بلند پہاڑ وصحرا ہیں''

بردلِ سالک ہزاراں غم بود گرزباغِ دِل خلالے کم بود

''سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہوجائے''

بہتیرے لوگ ہیں کہ ان کو خدا نے اطمینان دیا ہے۔ جائیداد کی آمدنی چلی آرہی ہے، گھر سے باہر قدم نکالنا نہیں پڑتا، پھر بھی دن رات فضول مضمون میں مبتلا رہتے ہیں، کہیں یہ ذکر ہورہا ہے کہ جاپان اور روس میں لڑائی ہورہی ہے کہیں جاپان

کو ڈگری دلا رہے ہیں کہیں روس کو، فکر پڑی ہے کہ کیا ہونا چاہیئے ۔ گویا ان کے سامنے روس وجاپان کا مقدمہ پیش ہوگا، اور فیصلہ کی ان سے درخواست کی جائے گی۔

دن رات ایسی ہی لایعنی باتوں میں مصروف ہیں۔ یہ اطمینان رکھیں ان کے پاس یہ مقدمہ نہیں پیش ہونے کا۔ ہاں اپنے اندر کے روس وجاپان کی فکر کریں۔اس کی بیشک ان سے باز پرس ہوگی کہ تم نے قوتوں کو جاسے صرف کیا ہے یا بے جا؟

ایسے شخص کو تو چاہیئے تھا کہ حبِ الٰہی میں غرق ہوکر اُن مقربین میں سے ہوجاتا جن کے ساتھ خصوصیت کے معاملات ہوتے ہیں۔

مقربین کے لئے مشقت

چنانچہ ایک بزرگ تھے انہوں نے پاؤں پھیلادیئے تھے، ان پر عتاب ہوا۔

مقربوں کے احکام ہی دوسرے ہوجاتے ہیں، جو باتیں عام لوگوں کو جائز ہوتی ہیں ان کے لئے بے ادبی میں داخل ہیں۔ ع

مقرباں را بیش بود حیرانی

''مقربین کے لئے حیرانی بہت ہوتی ہے''

اور گو اس میں مشقت شدید ہے لیکن قرب کے ساتھ اگر مشقت بھی اٹھانا پڑے تو کیا ؎

ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

''جس جگہ محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے، اگرچہ گہرا کنواں کیوں نہ ہو''

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے کہ یارے بَر خورد از وصل یارے

''وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محبّ اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو''

مشغول آدمی کے لئے خشوع کا مطلوب درجہ

حاصل یہ کہ ایک تو وہ تھا جو فارغ محض تھا، اور ایک وہ ہے جس کے متعلق اور بھی خدمتیں ہیں۔ اہل وعیال کا نان ونفقہ واجب ہے، درس و تدریس میں مشغول ہے، وعظ ونصیحت سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، اس کی طرف لوگوں کی حاجت ہے، ایسے شخص کو ایسا اہتمام خشوع کہ ہر وقت اسی میں رہے ناجائز ہے۔ اس کے ذمے خشوعِ واجب حاصل کرنا ہے۔ اس پر واجب ہے کہ عبادت کے وقت خشوع خاص پیدا کرے۔ کیونکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ جب تک کسی عبادت میں مشغول ہے دنیا کا کوئی کام تو کر ہی نہیں سکتا۔ پھر فائدہ کیا ہو کہ اس میں اپنا وقت مفت پریشان کرے۔ اس لئے یہ مرتبہ ہر شخص پر واجب ہے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ خدا کا کیا ہی انتظام ہے کہ نہ ہر شخص کو صوفی مستغرق بنادیا اور نہ غفلت کی اجازت عنایت ہوئی۔

خلاصہ وعظ

سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ پہلے تو مقدمہ بیان ہوا۔ جس میں عوام وخواص سب ہی کی شکایت تھی، کہ خشوع کیوں حاصل نہیں کرتے، اس کے بعد مقصود کا بیان ہوا، وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے اول حقیقت، دوسرے فرضیتِ خشوع، تیسرے طریقِ خشوع۔ اس کے بعد خاتمہ مذکور ہوا جس میں درجات

خشوع کا ذکر ہوا۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ توفیق عنایت فرمائے خشوع سے بہرہ وراور کامیاب بنائے۔آمین ثم آمین۔(۱)

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

(۱) اللہ تعالیٰ اس وعظ سے مستفید ہونے والے سب احباب کو خشوع کی دولت سے بہرہ ور فرمائے۔

خلیل احمد تھانوی
۱۴۳۱/۳/۲۱ھ